ثقافت
ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اِسلام کا بُنیادی عقیدہ

ہر نظریۂ حیات ایک بنیادی عقیدے پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ بنیادی عقیدہ اصل یا جڑ ہوتا ہے۔ اس جڑ میں سے جو درخت اُگتا ہے اس میں بے شمار شاخیں نکلتی ہیں اور ہر شاخ میں سے کثیر تعداد میں پتّے نکلتے ہیں۔ یہ اصل ثابت اور قائم ہوتی ہے شاخیں اور پتے سوکھتے اور جھڑتے ہیں۔ ان پر خزاں اور بہار کا عمل ہوتا ہے۔ فروع میں تجدد اور تغیّر درخت کی حیات کے بقا اور ارتقا کا باعث ہوتا ہے۔ روحانی زندگی کو بھی قرآن کریم نے ایک درخت ہی سے تشبیہ دی ہے جس کی اصل ثابت رہتی ہے اور اس کی فروع زمین سے لے کر آسمان تک پھیلتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کلمۂ طیبہ کیا ہے جو اس طرح کا ثبات و دوام رکھتا ہے۔ یہی کلمہ اصل دین اور اصل اسلام ہوگا۔ یہی وہ حقیقتِ حیات ہوگا جس سے تمام ہستی کی توحید ہو سکے اور جو وجودِ حقیقی اور ارتقائے حیات کا ضامن بن سکے۔ یہ کلمہ ایسا ہونا چاہئے جس کا عقیدہ عقل اور فطرت اور مشاہدے کی شہادت سے استوار ہو جو کسی فرد کا تصوّر یا وہم نہ ہو جس پر یقین کرنے کے لئے کورانہ اعتماد کا تقاضا نہ کیا جائے جو فطرت کی گہرائیوں میں سے اُبھرے اور فطرت کے مناظر و حوادث ہر قدم پر اس کی توثیق کرتے رہیں۔ فطرت کے تمام تقاضے اس سے بطریقِ احسن پورے ہو سکیں۔ یہ عقیدہ ہر قسم کی حکمت کی اساس ہو۔ تمام مسائلِ حیات کی گتھیاں اُس سے سُلجھ سکیں۔ حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی یا علم اور اخلاق کے اصول اس سے مستنبط ہو سکیں۔ زندگی کی لامتناہی کثرت اس ایک کلمے کی وحدت میں پروئی جا سکے۔ وہ کلمہ زندگی کے اوراقِ پریشاں کا شیرازہ بند ہو۔ اس کے اندر جو حقیقت مضمر ہو وہ حیاتِ جسمانی، حیاتِ مادی، حیاتِ اخلاقی اور حیاتِ روحانی سب پر حاوی اور سب میں جاری و ساری ہو۔

از روئے اسلام یہ عقیدہ یا کلمۂ طیبہ توحید ہے۔ قرآن نے اسی کو اصلِ دین قرار دیا ہے۔ دین کے باقی تمام ارکان، تمام شریعت، تمام شعائر، تمام عبادات، تمام اصولِ معاش اور عقائدِ معاد اس عقیدے کی شاخیں اور پتّے ہیں۔

شرائع میں اختلاف اور تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ عبادت کے طریقے کم و بیش مختلف ہو سکتے ہیں، اخلاقی اصول کے ہنگامی اطلاق میں اضافی تغیّر ہو سکتا ہے، سیاست کے انداز حالات کے تغیر کے ساتھ بدل سکتے ہیں لیکن اس کلمۂ طیبہ اور اس اصل ثابت میں کوئی بنیادی تغیّر نہیں ہو سکتا۔ تمام قرآن شرک کے خلاف ایک مسلسل جہاد اور توحید کے

دلائل کی تکرار ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اگر یہ عقیدہ کسی کے دل میں اچھی طرح گھر کر جائے، تو وہ حقیقتِ حیات سے آشنا ہو جاتا ہے باقی تمام ثانوی حقائق ایک منطقی لزوم کے ساتھ اس میں سے خود بخود سرزد ہونگے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے علاوہ اس کی تائید میں بعض صحیح احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ رسولِ کریمؐ اسی عقیدے کو بنیادِ دین اور عین دین سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں وہ احادیث خاص طور پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں کہ رسول کریمؐ نے ان کو اپنی ایک نشانی دی اور فرمایا کہ جاؤ اس کا اعلان کر دو کہ جس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا اس کی نجات ہوگئی۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ جس نے توحید کا اقرار کیا کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ ابو ہریرہؓ کے سپرد کردہ پیغام کے عوام تک پہنچانے میں حضرت عمر فاروقؓ حائل ہوئے۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کو اس تعلیم نے جھنجوڑ دیا۔ واقعہ یہ نہیں تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نعوذ باللہ اس کو درست نہ سمجھتے تھے۔ ان کو فقط یہ خطرہ ہوا کہ عوام میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھیں گے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا اور چھٹی ہو گئی۔ وہ محض اقرار باللسان کو کافی اور مکتفی سمجھ لیں گے اور اسلام جو نظامِ اخلاق اور ضابطۂ شریعت قائم کرنا چاہتا ہے اس کو اختیاری یا غیر ضروری سمجھ کر اس کی طرف سے غافل ہو جائیں گے۔ اگر توحید اقرار باللسان سے تصدیق بالقلب تک جا پہنچے تو اس شخص کی نظر میں اور اس کے نتیجہ کے طور پر اس کے عمل میں بھی ضرور ایک حیرت انگیز انقلاب ہوگا اور پوری اسلامی زندگی خود بخود اس میں سے شاخوں اور پتوں کی طرح پھوٹ پڑے گی۔ یہ بات سرسری زبانی اقرار سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ حضرت عمر فاروقؓ کو بجا طور پر یہ خطرہ محسوس ہوا کہ سست عمل لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور ممکن ہے کہ بعض بدعمل لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو جائیں کہ توحید کا اقرار ہمارے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ کی مصلحت بینی پر رسولِ کریمؐ معترض نہیں ہوئے۔ حضرت ابوذر کو یہ اعلان سن کر ایک دوسری طرح کا دھکا محسوس ہوا۔ وہ بجا طور پر اخلاقی عمل کو عقیدۂ توحید سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے براہِ راست رسولِ کریمؐ سے دو کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا اور پوچھا کہ توحید کا اقرار کرنے والا اگر چوری کرے یا زنا کا مرتکب ہو تو کیا پھر بھی اس کی نجات ہو جائے گی۔ اس پر رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ ہاں پھر بھی ہوگی۔ یہ جواب سن کر حضرت ابوذرؓ اور زیادہ پریشان ہوئے۔ دوبارہ پوچھا۔ پھر جواب ملا کہ ہاں۔ تیسری دفعہ پھر اپنے شک کو اضطراب کے ساتھ دُہرایا۔ جس پر رسولِ اکرمؐ نے کسی قدر ناراض ہو کر فرمایا کہ ہاں حقیقت یہی ہے جو میں کہہ چکا ہوں۔ علی رغم انف ابی ذر۔

جس طرح حضرت ابوذرؓ اس سے پریشان ہوئے اسی طرح اکثر مومن آج تک اس سے مضطرب ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی سادہ توجیہ یہی ہے کہ از روئے تقاضائے بشریت کسی وقت ایک موحد سے بھی معمولی کوتاہیوں سے بڑھ کر بڑے گناہ بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ تمام موحدوں اور مومنوں کا ایمان اپنی قوت اور بصیرت کے لحاظ سے ایک

درجے کا نہیں ہوتا۔ انبیاء اور اولیاء سے چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ کیونکہ خطا و نسیان بشریت کا تقاضا ہیں، لیکن ان کی روحانی بلندی اور استقامت کی وجہ سے کبائر اثم کا سرزد ہونا ان کی فطرت کے لئے ایک امر محال ہوجاتا ہے۔ عام موحدوں کا درجہ اس سے بہت پست ہوتا ہے۔ اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ عادی سارق اور عادی زانی نجات یافتہ ہوسکتے ہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کبھی کبھار ایک مومن موحد سے بھی اس قسم کی لغزش سرزد ہوسکتی ہے۔ اگر وہ واقعی مومن ہے تو وہ پشیمان اور تائب ہوگا، خدا کے ہاں سچی توبہ کی قبولیت کا وعدہ ہے۔ اس کی عارضی لغزش سے اس شخص کی سیرت مستقل طور پر خراب اور تاریک نہیں ہوگی جس کی سیرت میں توحید سرایت کرچکی ہے وہ خدا کی رحمت سے بہرہ اندوز ہے۔ توحید سے انسان کی طبیعت میں ایک فطری راستی پیدا ہوجاتی ہے۔ سیدھی نرم لکڑی کو خارجی دباؤ سے عارضی طور پر تھوڑا بہت جھکا سکتے ہیں لیکن جب وہ دباؤ ہٹ جائے تو وہ خود بخود اپنی راستی پر واپس آجاتی ہے۔ غفران اور رحمت اچھی سیرت ہی پر عمل کرسکتے ہیں۔

مذکورہ صدر احادیث کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کو اصل دین قرار دیتا ہے اور اس عقیدے کی اہمیت کو تمام دیگر اعمال کے مقابلے پر زیادہ اساسی تصور کرتا ہے۔ تمام رسالت اسی عقیدے کی توضیح اور تقویت کا ذریعہ ہے۔

قرآن کریم اپنے آپ کو حکمت کی کتاب قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ حکمت سب سے بڑی نعمت ہے ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا۔ نبیؐ کو بھی یہ حکم دیتا ہے کہ انسانوں کا تزکیۂ نفس کرے، ان کو یہ کتاب پڑھ کر سنا اور سمجھا اور اس تعلیم میں جو حکمت ہے اس کو ان پر آشکار کرے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ حکمت کیا چیز ہے اور توحید کے عقیدے کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔ بعض اور الفاظ بھی ہیں جو لفظ حکمت کے قریب قریب مرادف شمار ہوتے ہیں۔ علم معرفت یا عقل اور اہل مغرب کے ہاں سائنس کی اصطلاح مغربی حکیمانہ اندازِ فکر کو سائنٹیفک کہتے ہیں۔ علم و عقل کہیں یا حکمت اور سائنس دیکھنا یہ ہے کہ یہ کس اندازِ تفکر کا نام ہے کیا یہ کوئی نظری میلان یا جبلی پیاس ہے۔ اس کی ماہیت کیا ہے اس کا مقصود کیا ہے۔ اس کے اندر کیا بات ہے جس کی وجہ سے دین اس کو خیر کثیر کہتا ہے۔ قرآن کریم طرح طرح سے اس کی تلقین کرتا ہے کہ تدبر و تفکر اور تعقل سے کام لو۔ عقل سے کام نہ لینے والوں کو جانوروں سے پست درجہ دیتا ہے۔ ان کو گونگے، بہرے اور اندھے کہتا ہے۔ مشاہدۂ کائنات پر بڑا زور دیتا ہے۔ اسلام اس کا قائل ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اس میں تمام حوادث آئین کے زنجیریں، علت اور معلول کی کڑیاں ہیں۔ کوئی واقعہ عبث یا باطل نہیں ہوتا جس کو محض اتفاق کہتے ہیں اس کا وجود کہیں کائنات میں نہیں۔ مشیتِ الٰہی اور حکمتِ الٰہی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اسلام سے قبل تمام مذاہب نے خوارقِ عادت یا معجزات و کرامات کو خدا کی خدائی اور رسولوں کی رسالت کی حقانیت کا واحد ثبوت سمجھ لیا تھا اور یہ عقیدہ قائم کرلیا تھا کہ دین اور حکمت دو الگ الگ بلکہ متضاد چیزیں ہیں۔

دین کا تعلق مشاہدے اور عقل سے نہیں بلکہ بعض اَن دیکھی باتوں کو محض اعتبار پر مان لینا ہے۔

یہ تعلیم ادیان میں سب سے پہلے اسلام نے دی کہ فطرت کا مدار سنت اللہ پر ہے اور سنت اللہ میں کوئی تبدل و تغیر نہیں ہوتا۔ فطرت کے ثابت و قائم قوانین ہی سنت اللہ ہیں۔ لیکن فطرت اللہ اتنی ہی نہیں ہے جتنی حواس کو محسوس ہوتی ہے یا عقل جزوی یا عقل منطقی کی گرفت میں آتی ہے۔ اگر فطرت اللہ لامحدود ہے تو ہزارہ ہزار عالموں میں بھی کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی جس کو فوق الفطرت کہہ سکیں۔ ہماری محدود فطرت اور محدود نظر کے لئے تو حاضر کم ہے اور غائب زیادہ۔ حاضر محدود ہے اور غائب لامحدود۔ لیکن خدائے بصیر و علیم کے ہاں تو سب کچھ حضور ہی حضور ہے۔ ظلمت کہیں نہیں نور ہی نور ہے جو غیب ہمارے لئے غیب ہے وہ خدا کے لئے ازلی اور ابدی طور پر حاضر ہے۔ تمام فطرت لامتناہی ایک خدائے واحد کی شان کا مظہر ہے۔ فطرت میں ہر چیز کا ہر دوسری چیز کے ساتھ براہ راست یا بالواسطہ ربط ہے۔

انسان کی عدم معرفت اور تنگ نظری نے جب فطرت کا مشاہدہ کیا تو اس کو حوادث کی کثرت نظر آئی۔ ان حوادث میں ان کو کوئی باہمی ربط نظر نہ آیا۔ وہ آگ کو ایک الگ حقیقت سمجھا اور پانی کو الگ۔ ہر واقعہ کو کسی ایک قادر مطلق ہستی کے ساتھ منسوب کر دیا۔ تینتیس کروڑ عناصر و مظاہر و حوادث کے تینتیس کروڑ دیوتا بنا ڈالے اور یہ دیوتا بھی کوئی منظم جماعت نہ تھے۔ دیوتا ایک دوسرے سے حسد اور بغض رکھنے والے ایک دوسرے سے متصادم اور برسرِ پیکار اور ان سب کے مقابلے میں انسان حقیر اور بے اختیار۔ اشرف المخلوقات اسی شرک کی وجہ سے احسن تقویم کے مرتبے سے اسفل السافلین کے قعرِ مذلت میں جا گرا۔ جس کو خلیفۃ اللہ علی الارض بننے کے لئے خلق کیا گیا تھا اور جسے شمس و قمر اور شجر و حجر کی تسخیر کا کام سپرد کیا گیا تھا وہ خود ہی بے طرح مسخر ہو گیا۔ جسے حکمت و رحمت کی بنا پر خوف و حزن سے بالاتر ہونا تھا وہ ہر چیز کے سائے سے کانپنے لگا۔ موہوم دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنی قربانی کرنے لگا۔ جو جانوروں کا گوشت کھانے سے راضی نہ ہوتے تھے، ان کو اپنے چہیتے بیٹوں کا گوشت کھلانے لگا۔ جہالت سے شرک پیدا ہوا اور شرک سے مزید جہالت اور جہالت و شرک نے مل کر اس کو ظالم بھی بنا دیا اور مظلوم بھی۔ اپنے اوپر ظلم کرنا دوسروں پر ظلم کرنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ شرک سے اس نے اپنے اوپر ظلمِ عظیم کیا۔ اور اس ظلم نے اس کو کمال درجے کا ظالم بنا دیا۔ خلیفۃ اللہ علی الارض بننے کی صلاحیت والا انسان ظلوماً جہولاً ہو کر خذلان و خسران میں دستِ افسوس ملتا رہ گیا۔

انسان میں حکمت وہاں سے شروع ہوئی جہاں اس نے حوادث کی کثرت کو قوانین کی وحدت میں منسلک کرنا شروع کیا۔ عقل کا کام یہی ہے کہ وہ علت کو معلول کے ساتھ وابستہ کرے۔ اور حوادث کے باہمی روابط کا پتہ چلائے۔ عقل کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ ہر جزء کو کسی کل کے ساتھ وابستہ کرے۔ جزئیات سے کلیات تک پہنچے اور پھر

کلیات سے جزئیات کو اخذ کرے عقلی کا یہ کام یا حکمت کا یہ سفر تب تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک کہ تمام جزئیات کلیات میں منسلک نہ ہو جائیں اور تمام کلیات ایک کل میں جا کر ختم نہ ہوں، جو کل جزئیات سے پہلے بھی ہے، جزئیات کے اندر بھی ہے اور جزئیات کے بعد بھی۔

حکمت کلی یا معرفت تام اس کا نام ہے کہ جو کل اوّل میں مصدرِ وجود قرار دیا جائے وہی منتہائے وجود بھی ہو۔ ہر ظاہر باطن کا اظہار ہو اور ہر باطن ظاہر کا سرچشمۂ وجود۔ توحید کا دین بھی یہی ہے اور سائنس اور حکمت بھی اسی کا نام ہے۔ عالمِ طبیعی کی کوتاہ نظری اور خامی اتنی ہی ہے کہ وہ قوانین یا وحدتوں کی تلاش میں اپنے دائرۂ تحقیق کو مادی اور محسوس حوادث تک محدود کر لیتا ہے، مظاہرِ باطن کے لحاظ سے کچھ کلیات آفاق سے حاصل ہوتے ہیں اور کچھ کلیات انفس سے۔ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ انفس و آفاق دونوں کے کلیات از روئے مشاہدہ و عقل دریافت کرتے ہوئے ان سے آگے گزر کر ایسے کل کی طرف بڑھو جو انفس و آفاق یا ظاہر و باطن دونوں کی جزئیات اور کلیات کا ماخذ دونوں پر حاوی اور دونوں میں جاری و ساری ہے۔ قرآن حکیم فطرت کے مشاہدے پر بہت زور دیتا ہے اور اس کو خدا شناسی کا راستہ کہتا ہے لیکن فطرت خارجی بھی ہے اور باطنی بھی، وہ مادی اور جسمانی بھی ہے اور نفسی بھی اس لئے یہ ارشاد ہے کہ فی انفسکم افلا تبصرون، جس سے یہ تعلیم اخذ کی گئی ہے کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ جس کو اپنے نفس کا عرفان حاصل ہوتا ہے اُس کو خدا کا بھی عرفان حاصل ہوتا ہے۔ توحید محض اس عقیدے کا نام نہیں ہے کہ خدا یا معبود ایک ہے اور متعدد نہیں۔ قرآن حکیم نے توحید کے اس بنیادی عقیدے کی ضروری تشریح بھی کی ہے اور اس ذاتِ واحد کے صفات بتلائے ہیں۔

خدا کی سب سے اہم اور اساسی صفت رحمت ہے۔ رحمت کے مفہوم میں رحم بھی ہے اور محبت بھی اور فیض بھی۔ قرآن کریم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے اور سورۂ فاتحہ کا افتتاح ربوبیت و رحمت سے ہے۔ انسان کے لئے ہر وجود یا مادی ہے یا ذہنی، یا زمان میں ہے یا مکان میں، یا زمان و مکان دونوں میں، اس کے علاوہ وجود کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ لہٰذا خدا کی نسبت اگر ھو الموجود کہیں یا لا موجود الا اللہ کہیں تو یہ موجودیت کا تصور ایمانی یا وجدانی ہی ہو سکتا ہے اور مادی نہیں ہو سکتا۔ صفاتِ الٰہیہ کی بابت بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی ماہیت کیا ہے، خدا علیم ہے لیکن ہستیٔ مطلق میں علم کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے اس کا تصور ممکن نہیں، انسان کا ہر علم جزوی ہوتا ہے۔ اس کے کلیات بھی دراصل جزئیات ہی ہیں۔ ماورائے زمان و مکان عالمِ کل ہستی کا علم کس انداز کا ہوگا، یہ ادراک کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ لیکن خدا کے صفات کو انسان آثار و امثال سے کسی قدر پہچان سکتا ہے جیسا کہ عارف رومی کہہ گئے ہیں:

ہیچ ماہیات اوصافِ کمال
کس نداند جز بہ آثار و مثال

اسلام کا اصل اور بنیادی کام خدا کی نسبت انسانوں کے عقائد کو درست کرنا تھا۔ اسلام نے توحید ہی کو اصل دین قرار دیا ہے اور اس کی تعلیم یہ ہے کہ یہ اصل اگر درست رہے تو نتیجے کے طور پر تمام علم اور تمام عمل درست ہو سکتا ہے لیکن اگر یہی اصل بگڑ جائے اور فاسد عقیدوں سے شرک جلی یا شرک خفی پیدا ہو جائے تو زندگی کے تمام فروع اس اصل کے بگاڑ سے بگڑ جائیں گے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ نبیوں کا کام خدا کی توحید کی توضیح و تلقین ہے۔ رسالت ہمیشہ سے اسی حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ رہی ہے۔ اسلام میں ختمِ نبوّت کے عقیدے کی بنا بھی یہی ہے کہ آخری مرتبہ اس عقیدے کو خالص کر کے محفوظ کر دیا گیا۔ اس طرح سے رسالت کی جو غرض تھی وہ پوری ہو گئی۔ نوعِ انسان پر اس حجّت کا اتمام ہو گیا ماننے نہ ماننے کا اختیار ہے لیکن بات صاف کر دی گئی۔

اکثر مذاہب عقیدۂ توحید کے مدعی تھے لیکن کہیں بھی توحید کا تصوّر جہل کی آمیزش سے پاک نہ تھا۔ ایک خدا کے ساتھ لاتعداد دیوتا موجود تھے۔ زندگی کا اصلی کاروبار دیوتاؤں کی متلوّن مرضی پر موقوف تھا۔ ایک غیر مرئی خدا کے لئے کوئی حقیقی کام نہ تھا۔ عیسائیوں میں ایک خدا کا تصوّر موجود تھا، لیکن یہ خدا کسی ایک انسان میں مجسّم بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ ہر قوم میں اصلاحِ اخلاق اور صحیح عقیدۂ توحید کی تلقین کے لئے نبی بھیجے گئے، جو اعلیٰ درجے کے انسان ہی ہوتے تھے۔ وہ نہ قادرِ مطلق تھے اور نہ عالمِ کُل۔ ان کو غیب کی اتنی ہی خبر رہتی تھی جتنی کہ خدا کی طرف سے اُن کو مل جائے۔ لیکن ہندوؤں اور عیسائیوں نے اوتاروں کا تصوّر کر لیا، کہ دنیا کی اصلاح کے لئے خدا کسی انسان کی صورت میں اُتر آتا ہے۔ بھگوت گیتا میں کرشن کی زبانی یہی عقیدہ بیان کیا گیا ہے، جسے فیضی نے اس شعر میں ترجمہ کیا ہے:

چو بُنیادِ دیں سُست گردد بسے
برآریم خود را بشکلِ کسے

مشرق اور مغرب میں فلسفیانہ افکار ترقی کرتے ہوئے توحید تک پہنچ گئے تھے لیکن ویدانت اور جدید افلاطونیت میں خدا بالکل وراء الوراء اور نرگن یعنی صفات سے مطلقاً معرّا ہو گیا تھا۔ ان دونوں فلسفوں میں خدا نہ صاحبِ ارادہ ہستی رہی اور نہ انسانوں یا دیگر مخلوقات سے اس کا کوئی خالقیت یا ربوبیت کا تعلق باقی رہا۔ یونانی فلسفہ سقراط، افلاطون اور ارسطو تک پہنچ کر عقلی توحید کا ایک نظامِ فکر مرتب کر چکا تھا۔ انہوں نے عقلِ منطقی کو عقلِ کل قرار دیا اور خدا محض وحدتِ منطقی کا مرادف بن گیا۔ افلاطون نے کہا کہ عالمِ ازلی عالمِ مثل یا عالمِ تصوّراتِ عقلیہ ہے۔ تصوّرات ہی اعیانِ ثابتہ ہیں اور یہ اعیانِ ثابتہ ایک عینِ ثابت سے سرزد ہوتے ہیں۔ تمام تصوّرات کا ماخذ ایک تصوّرِ کُلی ہے جس کو علم کہتے ہیں۔ وہ صرف کلیات ہی کا ہو سکتا ہے، جزئیات کا علم، علم نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ جزئیات کے وجود میں عدم کی آمیزش ہے۔ معدوم معلوم نہیں ہو سکتا، اس لئے خدا کو جزئیات کا کوئی علم نہیں۔ خدا کلیات ہی کا ایک ڈھانچہ ہے، اس کو افراد سے کوئی واسطہ نہیں خدا خود ہی عالم ہے، اور خود ہی معلوم ہے۔ خدا کو اپنے سوا اور کسی چیز کا

علم نہیں اس لئے کہ خدا کے باہر ماسواء کا وجود ہی حقیقی نہیں۔ اس قسم کا خدا فلسفیوں کے کسی کام آجائے تو آجائے، باقی انسان اس سے کسی قسم کا رابطہ قائم نہیں کرسکتے۔ نہ ایسے خدا سے زندگی کا کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اور نہ انسانی نفس کو اس سے کسی قسم کی تسکین حاصل ہوسکتی ہے۔ فلاطینوس کے فلسفۂ اشراق میں خدا ایک مصدر نور بن گیا جس سے کائنات بطریقِ تنزل صرزد ہوتی ہے۔ جو کچھ اس سے سرزد ہوتا ہے، وہ بلا ارادہ سرزد ہوتا ہے اور وہ مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ یہ خدا ایسا نہیں ہے کہ اس کو پکارو تو وہ سُنے یا اس سے کوئی عبادت یا محبت کا رشتہ قائم ہوسکے۔ کچھ ایسا ہی حال ویدانیت کا بھی ہے جس نے دیوتاؤں سمیت تمام کائنات کو مایا یا وجودِ باہمی قرار دیا۔ ویدانت کی یہ ورا ورا لوراء ہستی بھی نہ خالق ہے نہ عالم، نہ رحمان، نہ رب۔ شنکر اچاریہ کے نزدیک یہ ذات نرگن یا صفات سے معرّا ہے۔ ہر وجود اور ہر انفرادی نفس دھوکے کی پیداوار ہے، زندگی کا مقصد اس کو باطل سمجھ کر اس سے گریز کرنا ہے، نفوس و موجودات کے بطلان کی معرفت اصل گیان ہے، جس کے حصول کے بعد نہ نفس باقی رہے گا اور نہ کائنات۔ اس نفسِ کلی سے ذاتِ مطلق کا اثبات ہوجائے گا۔

فلسفوں کے علاوہ ادیان کا یہ حال تھا کہ بدھ مت میں خدا بالکل غائب ہوگیا۔ کائنات اور نفوس بے حقیقت ہوگئے۔ ہر قسم کی آرزو ایک دھوکا ہے۔ آرزوؤں کے دھوکے حیات آفرینی کرتے ہیں اور یہ آرزوئیں عارضی طور پر مجسّم ہوجاتی ہیں۔ انسان کے لئے فقط ایک ہی آرزو حقیقی ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کی کوئی آرزو نہ رہے۔ آرزوؤں کے ناپیدا ہونے سے زندگی میں اوگون کا چکر ختم ہوجائے گا اور وہ حالت پیدا ہوجائے گی جسے نروان کہتے ہیں جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ نفیٔ مطلق کے بعد جو اثباتِ مطلق حاصل ہوتا ہے تصوّر کے لئے وہ خود بھی ایک سلبی کیفیت ہے جس کے متعلق کوئی ایجابی تصوّر قائم نہیں ہوسکتا۔ زندگی کا نصب العین زندگی کو الم آفریں دھوکہ سمجھ کر اس سے گریز کرنا ہے۔ گویا احسن لائحۂ عمل یہ ہے کہ زندگی سے ذہنی اور عملی گریز کے طریقے سیکھے جائیں۔ ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولا، ترک ترک۔ بدھ مت کا نظریۂ حیات اس مصرعہ سے بہتر چند الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتا۔ باطل سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں حق سے بھی نجات حاصل ہوگئی،

زندے دیدم نشستہ بر روئے زمیں — نہ کفر، نہ اسلام، نہ دنیا و نہ دیں
بے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں — در ہر دو جہاں کرا بود زہرہ ایں

کائنات بھی معدوم، دیوتا بھی مفقود، آرزوؤں کا صفایا، نصب العین حیات اور ہر چیز سے بے تعلقی، ہر شے سے نجات، نہ کوئی مقصود، نہ معبود، نہ تلاشِ بہبود۔ رہبانیت ترقی کرتے ہوئے کامل نفیٔ حیات تک پہنچ گئی۔

نصرانیوں نے مسیح علیہ السلام کی تعلیم کو عجیب طریقے سے مسخ کیا۔ وہ مسیحؑ جو اپنے لئے نیک کا لفظ بھی استعمال نہیں کرانا چاہتا تھا۔ (جب اس کو کسی نے اچھا کہا تو اس نے جواب دیا کہ اچھا تو میرا آسمانی باپ ہے) اس برگزیدہ بندہ کو خدا

کو غلط اندیش پرستاروں نے خدا کا شریک بلکہ عین خدا بنا دیا۔ توحید کی تعلیم دینے والا، تثلیث کا شکار ہو گیا اور اقانیم ثلاثہ میں سے ایک اقنوم بن گیا۔ پہلے اس کو خدا کا بیٹا بنایا پھر بیٹے اور باپ کو ہم ذات بنایا، پھر اس خدا کو تمام جہان کا کفارہ بننے کے لئے مصلوب ہو کر لعنت کی موت مرنا پڑا۔ خدائے رحیم اپنی رحمت اور ربوبیت کا اظہار اس سے بہتر طریقے سے نہ کر سکا۔ دیوتاؤں کو انسانی قربانی سے خوش کرنے کا عقیدہ ہزارہا برس سے توہم پرست انسانوں میں راسخ ہو چکا تھا۔ عیسائیت میں توحید اسی دورِ وحشت کی طرف عود کر گئی۔ مسیح رحمت بن کر آیا تھا لیکن اس کے پیروؤں نے اس کو ایک غیر عادل اور ظالم خدا کا نمایندہ بنا دیا۔ خدا کے رحیم ہونے کا دعوےٰ اس کے اعمال سے باطل کر دیا گیا۔ آدم کا گناہ موروثی ہو گیا۔ جو انسان پیدا ہو گیا، وہ ناکردہ گناہ مجرم پیدا ہو گا۔ خدا کو ذلیل کرنے کے بعد عیسائیت نے انسان کو ذلیل کیا۔ یہ جرم کسی نیکی سے نہیں دھل سکتا۔ حسنِ عمل نجات کے لئے کارگر نسخہ نہیں۔ خدا نے ایک طرف معصوم مسیح کو بھینٹ چڑھایا اور دوسری طرف یہ حکم دے دیا کہ کسی کے نیک اعمال کام نہیں آسکتے۔ جب تک کہ کوئی شخص اس پر ایمان نہ لائے کہ مسیح کی صلیبی موت اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گئی ہے۔ یہ ایمان پیدا کر لینے کے بعد بے عمل کو بھی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

ادیان اور فلسفوں کے اس مختصر بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ توحید کے عقیدے کو مسخ کرنے سے کس طرح زندگی کے متعلق تمام تصورات مسخ ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے اسلام نے توحید کو اصل دین قرار دیا ہے۔ اگر یہ عقیدہ درست ہو جائے تو عبادات بھی درست ہو جاتے ہیں اور معاملات بھی جس کا رابطہ خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے۔ اس کے نظریات اور اخلاقیات خود بخود بطور نتیجہ صراطِ مستقیم پر آجاتے ہیں۔ اسلام نے توحید کو اس قدر خالص کر دیا کہ اس سے زیادہ خالص کرنا ممکن نہیں۔

توحید ہی سے سرزد ہونے والا اسلام کا بنیادی عقیدہ جس سے باقی تمام عقائد اور اعمالِ صالحہ بطور نتیجہ حاصل ہوتے ہیں، یہی ہے کہ یہ کائنات مہمل اور بے مقصود نہیں ہے۔ یہ کائنات مایا نہیں، باطل نہیں، تماشا نہیں۔ خدا کی قوتوں اور نعمتوں کے خزانے لامحدود ہیں، لیکن وہ ہر شے کو ایک معیّن اندازے سے خلق کرتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز میں ایک صنعت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک صانع ہے، اس میں حسن و جمال ہے، جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصل ہستی خلّاق و جمیل اور جمال پسند ہے۔ اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی آئین کے ماتحت ہوتا ہے۔ کوئی واقعہ اتفاقی یا بے علت ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اسلامی عقیدے کے مطابق کوئی ہستی بے جان نہیں۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ زبانِ حال سے صانع کا تسبیح خوان ہے۔ خواہ ہم اس تسبیح کو نہ سمجھ سکیں:

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند ۔۔۔ با من و تو مردہ با حق زندہ اند

طبقاتِ وجود میں ہر طبقہ اپنا مخصوص آئین اور مخصوص نظام رکھتا ہے۔ آئین و نظم عقل کے مظاہر ہیں اس لئے

کہہ سکتے ہیں کہ مادی اجسام میں بھی ایک قسم کی عقل ہے۔ جسے ہم اپنے مقابلے میں لاشعوری عقل کہہ سکتے ہیں۔ اجرامِ فلکیہ اپنے مداروں میں نہایت حساب سے گردش کرتے ہیں کلٌ فی فلک یسبحون۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ بے حساب آگے پیچھے ہو جائے۔

اسلام سے قبل عقلیت اور روحانیت دونوں غلط راستوں پر پڑ گئی تھیں۔ معقولات اپنی تجرید میں موجودات سے بے تعلق ہو گئے تھے اور افلاطون کی طرح یہ نظریہ قائم کر لیا گیا تھا کہ معقولات لطیف ہیں اور موجودات کثیف، لہٰذا کثیف کو چھوڑ کر لطیف کی طرف صعود کرنا چاہئے۔ اسی نظریہ کے ماتحت جسم کو روح کا زنداں قرار دیا گیا۔ جسم کو گھلانا روح کی پرورش کرنے کے لئے لازمی ہو گیا۔ عقلیت اور روحانیت دونوں کا رُخ رہبانیت کی طرف ہو گیا، ادیان اور فلسفوں نے زندگی کے خلاف بغاوت کر دی، مادہ اور مادی کائنات، جسم اور جسمانی زندگی سب مردود اور ملعون ہو گئے۔ خالق کا مخلوق سے رشتہ منقطع ہو گیا، حکمت اور روحانیت یہی رہ گئی کہ فرار اور گریز کی راہیں تلاش کی جائیں۔ بدھ مت اور عیسائیت دونوں نے دنیاوی زندگی کو ملعون قرار دیا۔ نسل انسانی کی بقاء اور افزائش گناہ گاری کا فعل بن گیا۔ روحانی شخص اس کو کہنے لگے جو کوئی کام کاج نہ کرے۔ بھکشو بلند درجے کا انسان بن گیا، سادھو انسان کامل ہو گیا، راہب کے لئے شادی کرنا ناجائز ہو گیا۔ ایک مرتبہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو راہب سے ملاقات ہوئی، جو بیوی بچوں کو چھوڑ کر ہمالہ کے پہاڑ میں چلا گیا تھا۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ کالج میں فلسفہ پڑھتا تھا۔ میں نے یہ ارادہ کیا کہ تھوڑی سی بحث کر کے اس کی رہبانیت کو ایک لغو فعل ثابت کروں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ حضرت جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے اگر سب یہی اختیار کریں تو دنیا ہی ختم ہو جائے۔ اس نے جواب دیا کہ ہم یہی چاہتے ہیں۔ اس سے بہتر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ یہ دُنیا جو سراسر دھوکا ہے ناپید ہو جائے۔

دیگر مذاہب والے بعض اوقات پوچھتے ہیں کہ اسلام دنیا میں کیا نیا تصوّر لایا۔ اس کا جواب اور سہل ہے۔ اسلام نے کائنات کو حق اور زندگی کو نعمت قرار دیا۔ کچھ نعمتیں خدا کی ربوبیت مہیا کر دیتی ہے اور کچھ اور نعمتوں کو سعی و عمل کا نتیجہ شمار کرتی ہے، زندگی میں جو رکاوٹیں نظر آتی ہیں، وہ انسان کو مشقِ ارتقاء کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ زندگی کا مقصد عرفان اور سیرت سازی ہے، کوئی مشکل یا مصیبت شرِ محض نہیں، خدا خیرِ مطلق ہے، اس لئے وہ شرِّ مطلق کا آفریدگار نہیں ہو سکتا۔ مشیئت کا اصول یہ ہے کہ خدا شر سے برانگیزد کہ خیرِ ما در آں باشد۔ نظرِ عارف اور عملِ صالح ایک اکسیر ہے جو ادنیٰ کو اعلیٰ اور شر کو خیر میں تبدیل کر سکتی ہے۔ موت اور حیات ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ان میں کوئی تضاد اور تناقص نہیں۔ اگر کوئی شخص زندگی کے آئین سے آشنا ہو جائے، تو وہ ہر زحمت کو رحمت میں تبدیل کر سکتا ہے اور موت کو زندگی میں بدل سکتا ہے۔ آئینِ ہستی یہی ہے کہ ہر قدم پر فنا سے بقاء حاصل ہوتی ہے۔ رہبانی مذاہب اور فلسفوں کو زندگی سراسر زحمت دکھائی دی اور وہ پکار اُٹھے کہ:

یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

بعض نے کہا نہیں یہ ایسی لعنت ہے کہ سر جائے اور جان جائے تو بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہ ہو جب تک کہ اس سے چھٹکارے کا کوئی خاص نسخہ ہاتھ نہ آئے :

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کسی نے کہا کہ :

قیدِ حیات و بندِ غم اس میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

قرآن کریم اس کی تصدیق کرتا ہے کہ اگر ایمان یا صحیح زاویۂ نگاہ اور صبر کی صفت نہ ہو تو زندگی گھاٹے ہی کا سودا معلوم ہوگی۔ والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

فطرتِ خارجی کا بنانے اور چلانے والا خود خدا ہے۔ وہ اس میں نظم و آئین بھی پیدا کرتا ہے اور حسن و جمال بھی۔ وہ براہِ راست اس کی بقا اور ارتقاء کا ضامن ہے۔ لیکن انسان جس کو اس دنیا میں خدا کا نائب بنانے کے لئے بھیجا گیا ہے اس کے متعلق ایک دوسرا آئین ہے جس ہستی کو قدرت مطلقہ سے سب سے زیادہ بہرہ اندوز بنانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کو شروع میں سب سے زیادہ بے بس بنایا جاتا ہے۔ تمام حشرات الارض پیدا ہوتے ہی اپنی زندگی کے خود کفیل ہو جاتے ہیں۔ انسان کے بچے کی مدّت دراز تک یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر بروقت اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو وہ زندہ نہ رہ سکے۔ انسان کو مسخّر کائنات اور قادرِ علی الفطرت بنانا مقصود ہے ——— اس لئے اس کا وظیفۂ حیات یہ ہے کہ وہ خود اپنی تقدیر کا معمار ہے۔ اس سے کم تر مخلوق کی تقدیر کلیتاً خدائے قادر کی ساختہ پرداختہ ہے۔ انسان کو عقل اور اختیار اور غیر معمولی صلاحیتیں عطا کر کے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ان کے صحیح استعمال سے ہر مس خام کو کندن بناتا جائے۔ اگر اس کی نگاہ حقیقت شناس نہ ہوئی اور اس کا عمل صحیح نہ ہوا تو وہ کالانعام بل ھم اضل درجۂ حیات میں جانوروں سے بھی پست تر ہو جائے گا۔ اور اگر ایمان اور عملِ صالح کی اکسیرِ حیات سے کام لے گا تو خدا کی نیابت میں کائنات کا حکمران اور مسجودِ ملائک ہو جائے گا۔ انسان کے لئے زندگی خوانِ نعمت بھی ہے اور میدانِ جہاد بھی۔ اگر اس نے جدوجہد سے گریز کیا اور زندگی کی رکاوٹوں کو دیکھ کر آنسو بہانے لگا، تو کوئی نعمت بھی اس کے لئے نعمت نہ ہوگی۔ غلط روحانیت یا رہبانیت جدوجہد سے گریز کرنے سے پیدا ہوئی لیکن مشکلات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے سے مشکلات رفع نہیں ہو جاتیں بلکہ اور بدتر صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

رہبانیت حقیقت میں یاس اور قنوط کی پیداوار ہے۔ کمزور انسان جذبات کی کشاکش اور زندگی کی پیکار کو دیکھ کر ہر قسم کی بھلائی سے مایوس ہو گیا۔ اس میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ زندگی کو سدھار سکتا۔ اور

اس نے زندگی سے گریز کرکے سیدھا خدا کی طرف بڑھنا چاہا، لیکن قرآن حکیم کہتا ہے کہ وہ قربِ الٰہی اور رجعت الی اللہ کا حق ادا نہ کرسکا۔ کیونکہ اس کا زاویۂ نگاہ زندگی اور خدا دونوں کے متعلق غلط تھا۔ اس کا مقصود غلط نہ تھا، لیکن حصول کا راستہ غلط تھا جس کو اس نے صراطِ مستقیم سمجھا وہ ایک پُرپیچ بھول بھلیاں تھا۔ گمراہی سے اس کا راستہ اور طول ہوگیا۔ بس کہ دراز افتد جادہ زگمراہیم۔

یہ صحیح ہے کہ کوئی مذہب بھی جس میں قنوط ہی قنوط ہو فطرتِ انسانی کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ اس لئے رہبانی مذاہب نے اکثر یہ کیا کہ اس دنیا اور اس زندگی سے تمام اُمیدیں منقطع کرکے ان کو حیات بعد الموت یا کسی کیفیت ماورائی حیات کے ساتھ وابستہ کردیں جس سے ایک طرح کی آخرت پرستی پیدا ہوگئی۔ اسلام موجودہ زندگی سے اعلیٰ تر زندگی کا منکر نہیں ہے۔ لیکن اعلیٰ درجات، ادنیٰ درجاتِ حیات کا حق ادا کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے۔ اسلام ترکِ دنیا کا نام نہیں، بلکہ دنیا کو دین بنانے کا نام ہے۔ اسلام نے عبادت کا مفہوم بدل دیا۔ دیگر مذاہب میں عبادت ایک مخصوص فعل بن کر رہ گیا تھا جسے پوجا پاٹ کہتے ہیں، دیوتاؤں یا خدا کے سامنے کچھ بھینٹ یا نذر نیاز پیش کرنا یا ان کو خوش کرنے کے لئے معینہ منتر یا دعائیں پڑھنا۔ اسلام نے عبادت کے مفہوم کو وسیع کرکے تمام حیاتِ طیبہ کا ہم معنی بنادیا۔ دین کا مفہوم واضح اور معیّن کرنے کے ساتھ ہی خود بخود عبادت کا مفہوم بھی معیّن ہوگیا۔ اسلام میں دین اور فطرت اللہ ہم معنی ہیں۔ تمام موجودات خدا کی فطرت اور اس کی سنّت کی آئینہ دار ہے ازلی اور ابدی ہونے کے لحاظ سے اس کے آئین میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس فطرت میں تلوّن نہیں ہے۔ فطرت اللہ کا سب سے بڑا مظہر انسان ہے۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا ذٰلک الدین القیم۔ کسی مذہب یا فلسفے میں دین کی اس سے بہتر تعریف نہیں مل سکتی۔ کوئی کہتا ہے کہ دین ان عقائد کا نام ہے جن کا کوئی ثبوت مشاہدے یا عقل سے نہیں مل سکتا۔ کوئی کہتا ہے کہ دین فطرت سے گریز کرنے کا نام ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ دین عین فطرت ہے اس لحاظ سے کائنات میں کوئی چیز بھی بے دین نہیں ہے۔ شجر و حجر کا بھی دین ہے اور شمس و قمر کا بھی ـــــ تمام کائنات دین پر قائم ہے۔ ستاروں کا اپنے مداروں میں حساب سے چلنا ستاروں کا دین ہے۔ اور یہ حکم برداری ان کی عبادت ہے:

گر چرخ فلک گردی سر برخطِ فرماں نہ ۔۔۔ ور گوئے زمیں باشی وقفِ خمِ چوگاں شو

دیگر مذاہب میں یہ ہوا کہ عبادت کا مفہوم تنگ کردینے کی وجہ سے فقط خاص قسم کے مذہبی اعمال کو عبادت سمجھ لیا گیا۔ خاص خاص ایّام اور اوقات اور خاص خاص طریقے اس کے لئے مخصوص کردئے گئے۔ کچھ لوگ ان طریقوں کے ماہر قرار دیئے گئے۔ وہ پیشہ ور مذہبی گروہ بن گئے۔ ان پیشہ ور پیشواؤں کی مدد کے بغیر عام لوگ مخصوص عبادات بھی ادا کرنے کے مجاز نہ رہے۔ برہمنوں کے سوا وید کوئی نہ پڑھ سکتا تھا۔ نیچی ذات والوں کے لئے مذہب میں دخل اندازی اور یہ اجارہ شکنی جرمِ عظیم بن گئی جس کے لئے بڑی عذاب دہ سزائیں تجویز کی گئیں۔

عبادت ایک مخصوص تکنیک بن گئی، جو ہر شخص کے بس کی بات نہ رہی۔ پیشہ ور پروہتوں کو یہ خطرہ ہوا کہ اگر آزادانہ طور پر دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے لگے، تو مذہبی پیشواؤں کا تفوق زائل ہو جائے گا۔ اسلام نے معبود کو بلاواسطہ عابد کے قریب کر دیا۔ عابد و معبود کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہی۔ اسی طرح اسلام پہلا دین ہے جس نے عباداتِ مخصوصہ کے لئے بھی کسی معبد یا عبادت گاہ کو لازم قرار نہیں دیا۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ ہمارے دین کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ تمام دنیا ہمارے لئے مسجد بنا دی گئی ہے۔ دنیا کا چپہ چپہ سجدہ گاہ ہے۔ ہر قطعۂ زمین جس پر سجدہ کیا جاتا ہے۔ وہاں کا فرش عرش الٰہی سے ملحق ہو جاتا ہے۔ جب خدا انسان کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہو گیا۔ تو پیشہ ور مذہبی ایجنٹوں کی ضرورت نہ رہی جن کی مدد سے ہم خدا کا قرب حاصل کریں۔ اسلام میں نہ معبد کی ضرورت رہی اور نہ پیشہ ور عابد کی۔ اس کے علاوہ تمام اعمالِ صالحہ عبادت میں داخل ہو گئے۔ محنت سے روزگار پیدا کرنا بھی عبادت قرار دیا۔ الکاسب حبیب اللہ۔ دنیا کے تمام کاموں اور تمام حرفوں اور پیشوں میں وقار پیدا ہو گیا۔ کوئی کام فی نفسہٖ نہ ادنیٰ رہا نہ اعلیٰ۔ جو کام اصولِ خیر، حصولِ خیر اور آئینِ فطرت کے ماتحت کیا جائے وہ اعلیٰ کام ہے اور عبادت ہے اور بڑے سے بڑا کام اگر آئینِ الٰہی کو نظر انداز کر کے یا اس کی خلاف ورزی کر کے کیا جائے تو وہ مردود فعل ہے۔

اسلام کا بنیادی نظریہ ہی یہ تھا کہ دین اور دنیا الگ الگ چیزیں نہیں ہیں دنیا کو صحیح نظر سے دیکھنا اور اس میں حسنات کا پیدا کرنا ہی دین ہے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔ اسلام نے یہ گر بتایا کہ کس طرح تمام زندگی پر روحانیت کا رنگ یا صبغۃ اللہ چڑھ سکتا ہے۔ تمام طیبات انسان کے لئے حلال ہو گئے۔ علم و حکمت کے تمام دروازے کھل گئے۔ کوشش کرنے والوں کو یہ خبر دی گئی کہ صلاح و فلاح میں ساعی کو صحیح راستے بتائے جائیں گے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبلنا۔ حکمت کے طالب کو حکمت عطا ہو گی، جو خیر کثیر ہے جس سے اس کو حقیقت کا عرفان اور حیاتِ طیبہ حاصل ہو گی۔ اسلام نے مومن کے لئے ارتقاء کے تمام راستے کھول دیئے اور اس کا اعلان کر دیا کہ دین انسانوں کے لئے تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ اسلام میں نہ عبادات میں تنگی ہے اور نہ معاملات میں۔ خدا انسان سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتا جو اس کی قدرت اور ہمت سے بالاتر ہو۔ اسلام میں ہر حکم اور ہر ہدایت کے ساتھ تخفیف اور سہولت کے پہلو موجود ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ دو طریقوں میں سے وہ طریقہ اختیار کرو جس میں سہولت ہو بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اسلام نے جس دنیا کو مذموم قرار دیا وہ بے دین دنیا ہے جو خدا کی طرف سے غافل ہونے سے پیدا ہوتی ہے:

چیست دنیا از خدا غافل شدن نے قماش و نقره و فرزند و زن